اسلامی معاشرے کی تعمیر

بنیادی اصول

سید احمد عروج قادری

رمضان المبارک کی ایک شب قدر میں' غار حرا کے اندر جب وحی الٰہی کا پہلا نور چمکا اور جبریل امین' اللہ کے آخری نبی و رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس' **اقرا باسم ربک الذی خلق** کا حکم لے کر آئے' اس وقت سے لے کر تیرہ برس تک محمد عربیؐ فداہ امی وابی مکہ اور طائف کی وادیوں میں آفتاب جہاں تاب کی طرح گردش کرتے رہے اور پتھروں کے جواب میں ہدایت و سعادت کے پھول پھینکتے رہے۔ مکہ میں پہلے ان عقائد و حقائق کو ذہنوں میں راسخ کیا جاتا رہا جو پورے دین اسلام کی اساس اور بنیاد ہیں: توحید' رسالت اور آخرت۔ یہی وہ محور ہے جس کے چاروں طرف دین اسلام گردش کرتا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی مسئلہ ہو' اس کی بنیاد وہ عقائد ہی ہیں جن کی تعلیم اللہ اور رسولؐ نے دی ہے۔ خواہ مسائل زندگی کا تعلق معاشرے سے ہو یا معیشت سے' تہذیب و تمدن سے ہو یا سیاست سے۔ یہ بنیاد جس قدر مضبوط و محکم ہو گی' عمارت اسی قدر مضبوط و مستحکم ہو گی اور یہ بنیاد جتنی بودی اور کمزور ہو گی' عمارت بھی اتنی ہی بودی اور کمزور ہو گی۔

مکہ مکرمہ میں دو بڑے کام کیے گئے' ایک اساس دین کی تعمیر اور اس کا استحکام اور دوسرا' زندگی کے تمام شعبوں کے لیے رہنما اصول۔ مکہ مکرمہ میں تیرہ سال تک جو کچھ نازل ہوتا رہا' مدینہ منورہ میں اسی کے مطابق ریاست کی تشکیل اور معاشرے کی انفرادی و اجتماعی تعمیر کی گئی۔ جہاں تک اصول و کلیات کا تعلق ہے' شاید ہی ایسی کوئی اصل یا کلیہ نکل سکے جو مکہ میں نازل نہ ہوا ہو۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے تمام بنیادی اصول مکہ ہی میں نازل ہو گئے تھے بلکہ ان کی اچھی خاصی تفصیل بھی نازل ہو چکی تھی۔ ان تمام آیتوں کو جمع کر کے ان کی تشریح کرنے کے بجائے میں یہاں صرف **سورہ النحل** کی آیت ۹۰ کی روشنی میں چند بنیادی اصول پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ آیت ہر جمعے کو خطبے میں پڑھی جاتی ہے اور ہم اسے سنتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ○ (النحل ۱۶:۹۰) "اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، بدی اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم دھیان دو"۔

آیت کی جامعیت

خیر و شر، اخلاق حسنہ و سیئہ اور اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے مثبت و منفی بنیادی اصولوں کے لحاظ سے، یہ قرآن کی جامع ترین آیت ہے۔ روح المعانی میں لکھا ہے: "امام بخاری نے ادب المفرد میں، بیہقی نے شعب الایمان میں اور حاکم نے مستدرک میں، ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت خیر و شر کے لیے جامع ترین آیت ہے۔ بیہقی نے حسن بصری سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے"۔

یوں تو اس آیت نے عقائد تک کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے لیکن اس کا براہ راست تعلق محاسن اخلاق و رذائل اخلاق سے ہے۔ اچھے اخلاق کو عدل، احسان اور صلہ رحمی اور برے اخلاق کو فحشاء، منکر اور بغی میں جمع کیا گیا ہے۔ یہی چھ چیزیں اسلامی معاشرے کی مثبت و منفی بنیاد ہیں۔ روح المعانی کے مطابق: "ماوردی اور ابو نعیم نے معرفۃ الصحابۃ میں، عبدالملک بن عمیر سے روایت کی ہے۔ انھوں نے کہا: اکثم بن صیفی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع ملی تو انھوں نے آپؐ کے پاس جانا چاہا لیکن پہلے ان کی قوم کے دو افراد جانے کو تیار ہوئے۔ وہ دونوں آپؐ کے پاس پہنچے اور کہا ہم اکثم کے قاصد ہیں۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو اور کیا لائے ہو؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں محمد بن عبداللہ ہوں۔ خدا کا بندہ اور اس کا رسول، پھر آپؐ نے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ والی آیت تلاوت فرمائی۔ ان لوگوں نے پھر اپنا سوال دہرایا اور آپؐ نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ یہاں تک کہ انھوں نے سن کر یاد کر لی اور پھر واپس جا کر اکثم کو تمام باتیں بتائیں۔ اس نے آیت سن کر کہا: میں دیکھتا ہوں کہ وہ مکارم اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے اخلاق سے منع کرتے ہیں۔ پھر اکثم نے اپنی قوم سے کہا: اس معاملے میں تمھیں دوسروں سے پیچھے نہ رہنا چاہیے۔ نیز احمد، طبرانی اور بخاری نے ادب المفرد میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہی آیت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے دل میں استقرار ایمان کا سبب بنی تھی۔ اس آیت کی جامعیت ہی کی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو خطبہ جمعہ میں داخل فرمایا اور یہ بات ان کے اثر حسنہ میں داخل ہو گئی۔ ایک سے زیادہ علما کا قول ہے کہ قرآن میں اس آیت کریمہ کے سوا اور کوئی آیت نہ ہوتی تو قرآن کے تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ ہونے کے لیے کافی ہوتی (روح المعانی)۔

اس آیت کے بارے میں ابن جریر نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے: "اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر

یہ خلق حسن کا حکم دیا ہے جس کو اہل جاہلیت بہ نظر استحسان دیکھتے تھے اور ان کے یہاں اس پر عمل ہوتا تھا اور کوئی برا اخلاق ایسا نہیں ہے جس کو وہ عیب سمجھتے ہوں اور اس سے اللہ نے منع نہ کیا ہو"۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل نے یہ آیت سنی تو کہا تھا: محمد کا خدا مکارم اخلاق کا حکم دیتا ہے۔

قاضی نے اپنی تفسیر میں، ابن ماجہ سے حضرت علیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ جب اللہ نے اپنے نبیؐ کو حکم دیا کہ وہ اپنے آپؐ کو قبائل عرب کے سامنے پیش کریں تو آپؐ اس مقصد سے نکلے۔ میں اور ابوبکرؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ ہم قوم عرب کی ایک مجلس میں پہنچے۔ اہل مجلس پر سکون و وقار چھایا ہوا تھا۔ ابوبکرؓ نے پوچھا آپ لوگوں کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ انھوں نے جواب دیا: شیبان بن ثعلب سے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ وہ قریش کے مقابلے میں آپؐ کی مدد کریں کیونکہ قریش نے آپؐ کی تکذیب کی ہے۔ مقرون بن عمرو نے کہا آپؐ ہمیں کس امر کی طرف بلاتے ہیں؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے **ان اللہ یامر بالعدل والاحسان** کی آیت تلاوت فرمائی۔ یہ سن کر مقرون بن عمرو نے کہا: "خدا کی قسم! آپ کی دعوت مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی دعوت ہے۔ وہ قوم خود جھوٹی ہے جو آپؐ کی تکذیب کرتی ہے" (**تفسیر کبیر**)۔

میں نے اس آیت کریمہ کے بارے میں یہ تفصیل تین وجوہ سے پیش کی۔ ایک یہ کہ اس میں پیش کیے ہوئے بنیادی اصول کی جامعیت کا ایک اندازہ ہو، دوسری یہ کہ مکہ معظمہ میں دعوت اسلامی کی جدوجہد کا ایک ذرا سا جلوہ نظر آ جائے اور تیسری یہ کہ اس میں جو اصول بیان کیے گئے ہیں، وہ عالم گیر ہیں اور کوئی معاشرہ ان اصولوں کے بغیر انسانی معاشرہ بھی نہیں بن سکتا، چہ جائیکہ وہ اسلامی معاشرہ بن سکے۔

پہلا بنیادی اصول: عدل

عدل صرف اسلامی معاشرے ہی کا بنیادی اصول نہیں بلکہ اسی اصول پر پوری کائنات قائم ہے، **وبالعدل قامت السمٰوٰت والارض**، "عدل ہی پر آسمانوں اور زمین کا نظم قائم ہے"۔ عدل، عدالہ اور معدلہ کثیر الاطراف و کثیر المعانی الفاظ ہیں۔ اس لفظ کے لغوی معانی اور استعمالات کو سامنے رکھ کر اس کی جو جامع تعریف اخذ ہوتی ہے، وہ یہ ہے: "ہر شے کو وہ مقام دینا اور اس کے ساتھ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے وہ معاملہ کرنا، جس کی وہ مستحق ہو"۔ اس تعریف میں عدل کی تمام اقسام داخل ہو گئی ہیں۔ انسان کے اپنے نفس سے لے کر، کائنات کی تمام حقیقتیں اور تمام اشیا اس تعریف کے دائرے میں ہیں۔

عدل کا ایک ہم معنی، دوسرا لفظ جو قرآن میں بکثرت آیا ہے اور شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ تعداد میں خود لفظ عدل سے زیادہ استعمال ہوا ہے، وہ قسط ہے۔ لسان میں ہے: **والقسط بالکسر۔ العدل وھو من المصادر الموصوف بھا کعدل**، قسط کے معنی عدل ہیں اور یہ ان مصادر میں سے ہے جو مصدر عدل کی طرح وصف

بن کر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ عدل اور قسط میں لغوی استعمال کے لحاظ سے فرق یہ ہے کہ باب مجرد سے قسط کا اسم فاعل صرف ظالم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عادل کے معنی میں مقسط استعمال ہوتا ہے، مثلاً: وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (الجن ۷۲:۱۵)، "اور جو بے انصاف ہیں، وہ ہوئے دوزخ کے ایندھن"۔ اور وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (المائدہ ۵:۴۲)، "اور فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

قسط کے علاوہ تین لفظ اور ہیں جنھیں قرآن نے عدل کے معنی میں استعمال کیا ہے، قسطاس، میزان اور حق۔ قسطاس اور میزان تو محض لفظ کے اعتبار سے دو ہیں، ورنہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ قسطاس بھی میزان ہی کو کہتے ہیں۔ مفردات امام راغب میں ہے، والقسطاس: المیزان یعبر به عن العدالة کما یعبر عنها المیزان۔ قسطاس کے معنی میزان کے ہیں اور یہ دونوں لفظ عدالت کی تعبیر کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ امام راغب نے زیادہ وزن کے تحت لکھا ہے: "اللہ کا قول وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ اور اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ، اشارہ ہے عدل کی رعایت کا ان تمام افعال و اقوال میں جن کا انسان قصد کرتا ہے"۔

حق کا لفظ بھی قرآن میں عدل و انصاف کے معنی میں آیا ہے۔ سورہ ص میں ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ اور، فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (ص ۳۸:۲۶)، ان دونوں فقروں میں "حق" کا لفظ عدل و انصاف کے معنی میں آیا ہے۔

عدل بطور اخلاق: اللہ تعالیٰ نے اسلامی معاشرے کو عدل و قسط پر تعمیر کرنے کا جو حکم دیا ہے اس کی حیثیت محض اتنی نہیں ہے کہ کبھی کبھی عدل اختیار کر لیا جائے اور نہ یہ ہے کہ عدل کی کوئی خاص قسم پسند کر لی جائے بلکہ یہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد اور ہر خاندان اس کو اپنی صفت اور اپنا اخلاق بنا لے اور عدل کے کلی اور جامع مفہوم کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔ وہ کانٹے کی تول، اللہ کے حقوق، بندوں کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق اور کائنات کی دیگر اشیا کے حقوق، ادا کرے اور اس کا کوئی قول و فعل اس ترازو میں تلے بغیر باہر نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلق یعنی اخلاق کا اطلاق ہوتا ہی اس صفت پر ہے جو ملکہ یعنی نفس کی کیفیت راسخہ بن جائے۔ کسی اخلاق سے جب کوئی انسان متصف ہو جاتا ہے تو وہ اس سے دائماً اور بہ سہولت صادر ہوتا رہتا ہے، مثلاً سخاوت جب کسی انسان کا اخلاق بن جاتی ہے تو اسے بخل سے بیزاری ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے سخاوت آسان اور بخل دشوار ہو جاتا ہے۔ عدل کی جامع تعریف سامنے رکھنے کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس خلق حسن سے محرومی ہر خیر سے محرومی اور اس کی یافت ہر خیر کی یافت ہے۔

افراد کے بگاڑ سے خاندانوں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور خاندانوں کے بگاڑ سے معاشرہ بگڑتا ہے کیونکہ معاشرہ نام ہی ہے خاندانوں کے مجموعے کا۔ افراد میں بگاڑ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ وہ نہ اللہ کے حقوق عدل و

انصاف سے ادا کرتے ہیں اور نہ دوسرے افراد خاندان کے حقوق۔ وہ صفت عدل سے عاری ہو جاتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:

"عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، اعتدال و انصاف کی ترازو میں تُلے ہوں، افراط و تفریط سے کوئی پلہ جھکنے یا اٹھنے نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ جو بات اپنے لیے پسند نہ کرتا ہو، اپنے بھائی کے لیے بھی پسند نہ کرے"۔

"عدل" کی تشریح کرتے ہوئے سید مودودی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"اس مختصر فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔ پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے۔ اردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ "انصاف" سے ادا کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو۔ اور پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افراد معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوق شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل خلاف عدل ہے، مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی و اخلاقی مساوات اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے، وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن و تناسب ہے اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں" (تفہیم القرآن ج ۲، ص ۵۶۵)۔

"عدل" کی اس تشریح کو سامنے رکھ کر تصور کیجیے اس معاشرے کا جس کے افراد اس صفت سے متصف ہوں۔ وہ کتنا صاف ستھرا اور امن و سکون کا معاشرہ ہو گا۔ امن و سکون میں خلل تو اس لیے واقع ہوتا ہے کہ لوگ دوسروں کے حقوق کم سے کم بھی ادا نہیں کرتے اور اپنے حقوق زیادہ سے زیادہ وصول کرنے پر اصرار کرتے اور اس کے لیے آمادۂ پیکار رہتے ہیں۔

اوپر کی تشریح میں عقائد کا ذکر اس لیے آیا ہے کہ کائنات میں سب سے بڑا عدل، توحید اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔

دوسرا بنیادی اصول: احسان

صفت احسان کی حقیقت سمجھنے کے لیے صفت عدل کی تشریح سامنے رہنی چاہیے، اس لیے کہ "احسان" عدل پر ایک اضافہ ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:

"احسان" کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذات خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل و انصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل و عفو اور تلطف و ترحم [شفقت و مہربانی] کی خو اختیار کرے۔ فرض ادا کرنے کے بعد تطوع و تبرع [انفاق اور نوافل] کی طرف قدم بڑھائے۔ انصاف کے ساتھ مروت کو جمع کرے اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا، خدا اسے دیکھ رہا ہے۔ ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا"۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"احسان" عدل سے ایک زائد شے ہے۔ یہ صرف حق کی ادائگی ہی کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ مزید برآں یہ تقاضا بھی کرتا ہے کہ دوسرے کے ساتھ ہمارا معاملہ کریمانہ اور فیاضانہ ہو" (تدبر قرآن، ج ۱، ص ۴۳۹)۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ نے احسان کی یہ تشریح کی ہے:

"دوسری چیز "احسان" ہے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا۔ یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ اگر معاشرے کی اساس عدل ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد، ہر وقت ناپ تول کر دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کش مکش تو نہ ہو گی مگر محبت اور شکرگزاری اور عالی ظرفی اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشوونما دینے والی قدریں ہیں" (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۶۵)۔

غور کرنے کی بات ہے کہ عہد رسالتؐ میں کن بنیادوں پر اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی گئی تھی اور آج ہمارا حال کیا ہے۔ "احسان" پر عمل کرنے والا تو شاید ہزاروں میں ایک ہو۔ یہاں تو عدل بھی غائب ہے اور ظلم و زیادتی کا راج ہے۔ مسلمان، افراد اور خاندان پر ظلم کر رہا ہے اور اس سے بے خبر ہے کہ دوسروں پر ظلم، خود اپنے اوپر ظلم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دنیا میں اپنے اوپر ظلم کا اثر دکھائی نہ دے لیکن آخرت

میں یہ ضرور دکھائی دے گا کہ دوسروں پر ظلم کر کے اس نے خود اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کیا تھا۔

تیسرا بنیادی اصول: صلہ رحمی

"ایتا ذی القربیٰ" (قرابت داروں کو دیتے رہنا) صلہ رحمی کی تعبیر ہے۔ عدل و احسان میں صلہ رحمی داخل ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کا مستقل علیحدہ سے حکم دیا گیا ہے اور اسلامی معاشرے میں جو خاندانوں کے مجموعے کا نام ہے، ہر انسان خواہ وہ پڑھا لکھا ہو یا ناخواندہ اس کی اہمیت سے عملاً واقف ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے حاشیہ قرآن میں لکھا ہے:

"صلہ رحمی ایک مستقل نیکی ہے جو اقارب و ذوی الارحام کے لیے درجہ بدرجہ استعمال ہونی چاہیے۔ گویا "احسان" کے بعد ذوی القربیٰ کا بالتخصیص ذکر کر کے متنبہ فرما دیا کہ عدل و انصاف تو سب کے لیے یکساں ہے لیکن مروت و احسان کے وقت بعض مواقع، بعض سے زیادہ رعایت و اہتمام کے قابل ہیں۔ فرق مراتب کو فراموش کرنا، ایک طرح قدرت کے قائم کیے ہوئے قوانین کو بھلانا ہے"۔

صلہ رحمی کے حکم اور اس کی ترغیب و تلقین سے قرآن بھی بھرا ہوا ہے اور احادیث بھی۔ احسان اور صلہ رحمی کے سب سے اول اور سب سے زیادہ مستحق والدین ہیں اور ان دونوں میں بھی ماں، باپ سے زیادہ احسان اور صلہ رحمی کی مستحق ہے۔ اس سلسلے میں متعدد آیتیں اور احادیث آتی ہیں۔

صلہ رحمی کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

"ایتای ذی القربیٰ، احسان کی ایک نہایت اہم فرع ہے۔ قرابت مند عدل و احسان کے حق دار تو ہیں ہی، مزید برآں وہ بربنائے قرابت مزید انفاق کے مستحق ہیں۔ صاحب مال کو اپنے عزیزوں اور رشتے داروں پر فیاضی سے خرچ کرنا چاہیے" (تدبر قرآن، ج ۴، ص ۴۳۹)۔

صلہ رحمی کی تشریح کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

"صلہ رحمی رشتے داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتے داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتے داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعت الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں، اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ شریعت خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی

ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق، اپنے خاندان کے خوش حال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔ اور ہر خاندان کے خوش حال افراد پر پہلا حق، ان کے اپنے غریب رشتے داروں کا ہے، پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حق دار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں، اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں۔ یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمرؓ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپؓ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتے دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (unit) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے، اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوش حالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۶۵-۵۶۶)۔

اسلامی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے یہ تین مثبت بنیادی اصول ہیں اور اسی کے مقابلے میں تین منفی چیزیں ہیں جن سے اسلامی معاشرے کو پاک صاف ہونا چاہیے۔

۱۔ **فحشا**: فحشا کھلی ہوئی بے حیائی کے کام کو کہتے ہیں جن میں سب سے نمایاں، زنا اور عمل قوم لوط ہے۔ پھر برہنگی و عریانی، گالی گلوچ، بدکلامی، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظرعام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمایش کرنا، یہ سب چیزیں فحشا میں داخل ہیں اور ان میں سے اکثر زنا کے وسائل ہیں۔ عہد حاضر میں ایک نہایت شنیع بدکاری یعنی لواطت نے یورپ اور امریکہ میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو مقام اس فعل بد کو قوم لوط میں حاصل تھا۔

۲۔ **منکر**: اس سے مراد ہر وہ برائی ہے جس کو انسان بالعموم برا جانتے ہیں۔ انسانی فطرت ان سے ابا (انکار) کرتی ہے اور آسمانی شریعتوں نے جن کو برائی قرار دیا ہے، جیسے جھوٹ، اتہام، چوری، رہزنی وغیرہ۔

۳۔ **بغی**: اس کے معنی زیادتی، سرکشی اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی کے ہیں۔

[مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حاشیہ قرآن میں فحشا، منکر اور بغی کے متعلق لکھتے ہیں:

"منع بھی تین چیزوں سے کیا۔ فحشا، منکر، بغی۔ کیونکہ انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے بے موقع اور غلط استعمال سے ساری خرابیاں اور برائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ قوت بہیمیہ شہوانیہ، قوت وہمیہ شیطانیہ، قوت غضبیہ سبعیہ۔ غالباً فحشا سے وہ بے حیائی کی باتیں مراد ہیں جن کا منشا شہوت و بہیمیت کی افراط ہو۔

"منکر" معروف کی ضد ہے یعنی نامعقول کام جن پر فطرت سلیمہ اور عقل صحیح انکار کرے۔ گویا قوت وہمیہ شیطانیہ کے غلبے سے قوت عقلیہ ملکیہ دب جائے۔

تیسری چیز "بغی" ہے یعنی سرکشی کر کے حد سے نکل جانا، ظلم و تعدی پر کمربستہ ہو کر درندوں کی طرح کھانے پھاڑنے کو دوڑنا، اور دوسروں کے جان و مال یا آبرو وغیرہ لینے کے واسطے ناحق دست درازی کرنا۔ اس قسم کی تمام حرکات قوت سبعیہ غضبیہ کے بے جا استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ الحاصل آیت میں تنبیہ فرما دی کہ انسان جب تک ان تینوں قوتوں کو قابو میں نہ رکھے اور قوت عقلیہ ملیکیہ کو ان سب پر حاکم نہ بنائے، مہذب اور پاک نہیں ہو سکتا"۔

مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ اس ضمن میں حاشیہ قرآن میں لکھتے ہیں:

"ان میں مامورات کے مقابل منہیات بھی تین ہی ہیں: **فحشا**: ایسی برائی ہے جو کھلی ہوئی اور صریح ہے، یعنی علانیہ، پبلک میں کی جاتی ہے، اس کے تحت وہ سب برائیاں آ گئیں، جو قوت شہویہ کی افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔

منکر: عام ہے ہر ایسے امر کو جو شعائر اسلامی سے باہر ہو۔ اس کے تحت وہ سب معاصی آ گئے جو قوت غضبیہ کے افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔

البغی: وہ ظلم و سرکشی ہے جس کا ضرر دوسروں تک پہنچے۔ اس کے ماتحت وہ سب حرکتیں آ گئیں جو قوت وہمیہ کے غلبہ و افراط سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اس وعظ سے مقصود یہ ہے کہ تم اپنے میں تذکر و تنبہ پیدا کرو"۔

مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں: **فحشا** ہر ایسے برے فعل یا قول کو کہا جاتا ہے جس کی برائی کھلی ہوئی اور واضح ہو، ہر شخص اس کو برا سمجھے۔ **منکر** وہ قول و فعل ہے جس کے حرام و ناجائز ہونے پر اہل شرع کا اتفاق ہو۔ اس لیے اجتہادی اختلافات میں کسی جانب کو منکر نہیں کہا جا سکتا، اور لفظ **منکر** میں تمام گناہ ظاہری اور باطنی، عملی اور اخلاقی، سب داخل ہیں۔ بغی کے اصلی معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں، مراد اس سے ظلم و عدوان ہے۔ یہاں اگرچہ لفظ منکر کے مفہوم میں فحشا بھی داخل ہے اور بغی بھی، لیکن فحشا کو اس کی انتہائی برائی اور شناعت کی وجہ سے الگ کر کے بیان فرمایا اور مقدم کیا، اور بغی کو اس لیے الگ بیان کیا کہ اس کا اثر دوسروں تک متعدی ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ تعدی باہمی جنگ و جدل تک یا اس سے آگے عالمی فساد تک پہنچ جاتی ہے۔

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ظلم کے سوا کوئی گناہ ایسا نہیں جس کا بدلہ اور عذاب جلد دیا جاتا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظلم پر آخرت کا عذاب شدید تو ہونا ہی ہے، اس سے پہلے دنیا

میں بھی اللہ تعالیٰ ظالم کو سزا دے دیتے ہیں، اگرچہ وہ یہ نہ سمجھے کہ یہ فلاں ظلم کی داستان ہے، اللہ تعالیٰ نے مظلوم کی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس آیت نے جو چھ حکم ایجابی اور تحریمی دیے ہیں اگر غور کیا جائے تو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی مکمل فلاح کا نسخہ اکسیر ہیں۔ رزقنا اللّٰہ تعالٰی اتباعہ (معارف القرآن، ج ۵، ص ۳۷۹-۳۸۰)۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے بقول:

فحشا: کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کو کہتے ہیں، مثلاً زنا اور لواطت اور اس قبیل کی دوسری برائیاں۔

منکر: معروف کا ضد ہے، معروف ان اچھی باتوں کو کہتے ہیں جن کا ہر اچھی سوسائٹی میں چلن ہو، مثلاً مہمان داری، مسافر نوازی اور اس قبیل کی دوسری نیکیاں۔ منکر اس کا ضد ہے تو اس سے مراد وہ باتیں ہوں گی جو معروف اور عقل و عرف کے پسندیدہ طریقہ اور آداب کے خلاف ہوں۔

بغی: کے معنی سرکشی اور تعدی کے ہیں یعنی آدمی اپنی قوت و طاقت اور اپنے زور و اثر سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور اس سے دوسروں کو دبانے کی کوشش کرے (تدبر قرآن، ج ۴، ص ۴۳۹)۔

سید مودودیؒ نواہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اوپر کی تین بھلائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز فحشا ہے جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے، مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عمل قوم لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے، مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا، اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمائش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بغی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۶۶-۵۶۷)۔

سید قطب شہیدؒ اس ضمن میں لکھتے ہیں: دنیا میں کوئی معاشرہ بھی فحاشی، منکرات اور ظلم پر قائم نہیں رہ

سکتا۔ ایسا معاشرہ کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتا جس میں فحاشی وسیع پیمانے پر رائج ہو، نیز ایسی سوسائٹی بھی کبھی پنپ نہیں سکتی، جس میں منکرات نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہو۔ ایسا کوئی ملکی نظام قائم نہیں رہ سکتا جس کی اساس ظلم پر ہو۔

کوئی بھی معاشرہ ایسے اجتماعی نظام کو بہت ہی کم عرصے تک برداشت کرتا ہے، جلد ہی اس نظام کے خلاف لوگ احتجاج شروع کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ایسا کوئی ظالمانہ اور جابرانہ معاشرہ پر قوت اور پرشوکت ہو۔ اگرچہ ایسے اجتماعی نظام کے بااختیار لوگ ایسے نظام کی حمایت اور بچاؤ کے لیے لا انتہا وسائل استعمال کریں۔ انسانی تاریخ کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو یہ تاریخ درحقیقت فحاشی، منکرات اور ظلم کے خلاف مسلسل احتجاج سے عبارت ہے۔ لہٰذا اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ تاریخ میں کچھ عرصے تک کوئی اجتماعی نظام فحاشی، منکرات اور ظلم پر قائم رہا ہے۔ ایسے نظاموں کے خلاف چونکہ ہمیشہ احتجاج اور ردعمل ہوتا رہا ہے، اس لیے تاریخ سے یہی سبق ملتا ہے۔ (فی ظلال القرآن، ج ۴، ص ۳۳۴)]۔

جس معاشرے میں عدل و احسان اور صلہ رحمی کی نسیم جاں نواز چل رہی ہو اور وہ فحشا و منکر اور زیادتی و تعدی کی باد سموم سے محفوظ ہو، وہی اسلامی معاشرہ ہے اور یہی معاشرہ ہے جسے وجود میں لانے کے لیے ہم سب کو وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو ہم کر سکتے ہیں۔

سورہ النحل کے بعد سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۲۲ تا ۳۹ کو بعض مفسرین قرآن نے بجا طور پر سورہ نحل کی آیت ۹۰ کی تفصیل و تشریح قرار دیا ہے۔ (تفصیلی مطالعے کے لیے متعلقہ آیات کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں)۔

یہ ہے اسلامی معاشرے کا وہ نقشہ جس کے مطابق اس کی عمارت بنتی ہے۔ یہ خاکہ مکہ معظمہ میں نازل ہو گیا تھا، مدینہ منورہ میں اسی خاکے میں رنگ بھرا گیا اور اس معاشرے کی تشکیل ہوئی جس کی نظیر سے انسانی تاریخ خالی ہے اور جس کی تمنا ہر مخلص مسلمان کے دل میں آج بھی ہے۔ ہماری کوششیں بھی ایسا معاشرہ تعمیر کرنے کے لیے وقف ہونا چاہییں۔ (تدوین و اضافہ: امجد عباسی)

امریکہ میں ترجمان القرآن کا باقاعدگی سے مطالعہ کرنے کے خواہش مند درج ذیل پتہ پر 20 ڈالر ارسال کر کے سال بھر پرچہ منگوا سکتے ہیں۔

Islamic Education & Media

730 E 10St GF Brooklyn NY 11230

Ph: (718) 421 - 5428

یہاں سے فرائیڈے اسپیشل، جسارت، ایشیا اور منشورات کے کتابچے بھی حاصل کیے جا سکتے ہیں